Research Journal
Tahqeeqat
جلد:4، شمارہ:4، 2025ء
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334
ریسرچ جرنل
تحقیقات

مولانا ظفر علی خان کی نظم نگاری میں ردِ استعماریت

Anti-Colonialism in the Poetry of Moulana Zafar Ali Khan

Dr. Shumaila Suleman
Visiting Faculty, Department of Urdu, University of Narowal, Narowal.

ڈاکٹر شمائلہ سلیمان
استاد شعبہ اردو یونیورسٹی آف نارووال، نارووال

Abstract

"Maulana Zafar Ali Khan was a prominent, journalist and poet of Sub-Continent. He used his newspaper "Zamindar" for mobilizing native people against British Raj. His poetry based on resistance played pivotal role in independence movement. In his poems, he criticized the colonial power regarding its every action which was causing country's interests. As poet, Zafar Ali highlighted the points which could be harmful for the people of Hindustan. He always did his best for human rights, women empowerment and economic oppurtunities for common man. His poetry kept the Hindu-Muslim united for struggle of independence. His anti-colonial sentiment presented through his poems, resulted into closeness of newspaper and imprisonment of himself but he carried on exposing ruling power. His powerful voice of poetry gave courage to common people for got freedomfrom foreign invader. He did not hesitate to criticize thelocal politician and others who were supporter of Britishers.This article highlighted the salient features of his poetry."

Keywords: *Colony, Freedom, Independence, Zafar, Zamindar, Hind*

کلیدی الفاظ: نو آبادی، آزادی، خود مختاری، فتح، زمیندار، ہندوستان

۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد مسلمانوں کی حالتِ زار کی بہتری کے لیے کام کرنے والے تین نام اہم ہیں جن میں جسٹس امیر علی خان بہادر، عبداللطیف خان اور سر سید احمد خان شامل ہیں۔ سر سید کو ان پر فوقیت کام کی نوعیت کی وجہ سے ہے۔ علی گڑھ میں قائم ادارے نے جس طرح کی علمی وادبی فضا بنائی وہ دور دراز سے طلبا کو کھینچ کر لے آئی۔ ظفر علی خان بھی اس قافلہ کے رکن بن گئے جس کے میر کارواں سر سید تھے۔ مولوی عبدالحق، سر ضیاالدین اور مولوی طفیل احمد، ظفر علی خان کے ہم جماعت تھے۔

استدلالی و منطقی فکر، ادبی ذوق، زبان کا لوچ اور وسعت قلب و نظر جیسے اوصاف انھوں نے یہاں کے ماحول سے حاصل کیے۔ شاعری کا جوہر ان کی طبیعت میں قدرت نے رکھا تھا۔ ان کے والد گرامی مولوی سراج الدین احمد کے دوست رائے بھاگ مل (وزیر سیاست کشمیر) کی سفارش پر ریزیڈنٹ کشمیر کرنل پیراڈو(Perado) نے ظفر علی خان کی تقرری بطور ایکسٹرا اسسٹنٹ کشمیر(Extra Assistant Commissioner) کر دی مگر ان کی حریت پسندی اور سامراج سے نفرت یہ آفر قبول کرنے میں مانع ہوئی۔

اس زمانے میں یعنی بیسویں صدی کے آغاز سے ہی حیدرآباد دکن علمی وادبی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔ نظامِ دکن کی ادب پروری اور سخن شناسی کا شہرہ سن کر کئی ادیب و شاعر اس سرزمین کا رخ کر رہے تھے۔ داغ دہلوی، ظہیر دہلوی، عبدالحلیم شرر، علی بلگرامی، سید حسین بلگرامی، گرامی جالندھری، ترک علی ترکی، مولوی عبدالحق سمیت کتنے ہی اہلِ علم یہاں کھنچے چلے آئے۔

دکن میں قیام کے دوران ہی انھیں جمال الدین افغانی کی فکر سے بھی استفادے کا موقع ملا۔ ان کی کتاب ''الردالدھرین'' جو ۱۸۷۹ء میں ہندوستان آمد پر تخلیق کی گئی، کی رو سے عوام کے قلوب واذہان کو ضعیف الاعتقادی اور اوہام پرستی سے پاک کرنا لازم ہے تاکہ توحید الٰہی کے راسخ عقیدے کی بنا پر تزکیہ نفس یقینی بنایا جائے۔ عقلی دلائل پر قائم مسلک سے ہی دورِ حاضرہ کے مسائل کا حل ممکن ہے۔ یہ دراصل وہی طریقہ ہے جو سرسید اور اقبال کا بھی مطمع نظر تھا۔

مولانا ظفر علی خان شعلہ بیان مقرر، صحافی اور سیاسی نظریاتی کارکن تھے جو غلامی کی زنجیریں توڑنے کے آرزو مند تھے۔ یوں تو ان کی پہچان اخبار ''زمیندار'' ہے جس کی بازگشت پورے برصغیر کے طول وعرض میں آزادی کے علم بردار کے طور پر سنی گئی اور جس کو سامراج نے ہمیشہ تادیبی کارروائی کے ذریعے نشانے پر رکھا۔ اس کا ادارتی نوٹ مولانا ظفر علی خان کے کاٹ دار لہجے اور دبنگ انداز کی وجہ سے حکومتِ وقت کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا کیونکہ اس اخبار کی سرکولیشن عام آدمی کی دسترس میں تھی اور ایک طرح سے رائے عامہ پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی تھی مگر اس پر مستزاد ظفر علی خان کی مزاحمتی شاعری تھی جس کی گھن گرج سے ایوان اقتدار میں لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ظفر علی خان کی زبان صاف، شستہ اور رواں تھی۔ موضوعات کی ترشی میں بھی ادبی شیرینی موجود تھی۔ انھوں نے خود اپنی اس خوبی کو یوں بیان کیا ہے:

میں نے ادب کی بزم کو رخشندہ کر دیا — دہلی و لکھنؤ کا ہے میری زباں میں لوچ

ان کی نظموں میں قصیدہ کی سی بلند آہنگی اور شکوہِ الفاظ اور ہجو جیسی طنز اور مذمّت برابر ملتی ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی ایک نظم، جب انگریزی راج کا سورج اپنے نصف النہار پر تھا، میں انھوں نے حریت سے مملو خیالات کا اظہار کیا اور عوام کو امید دلائی کہ غلامی کی زنجیریں جلد ٹوٹیں گی اور ہندوستان آزاد ہو جائے گا:

نئی تہذیب کی مشکل کے گل ہونے کا وقت آیا — زمیں پر ٹوٹ کر گرنے کو گردوں کے ستارے ہیں

تباہی آئے گی یورپ کے جنگی دیوتاؤں پر — فرشتے کر رہے کچھ دن سے آپس میں اشارے ہیں(۱)

''اللہ کے پیارے'' کے عنوان سے تخلیق کی گئی اس نظم کے تین سال بعد دوسری عالمی جنگ کا آغاز ہوا اور پورا یورپ اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ جرمنی، فرانس، اٹلی اور برطانیہ براہِ راست اس سے متاثر ہوئے اور ان کی معیشت تباہ وبرباد ہو گئی جس کی وجہ سے انھیں اپنی کالونیوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ کالونیل پاورز کی طاقت کا ایک راز مقامی غداروں اور ٹاؤٹوں کی امداد بھی ہے۔ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان سمیت کتنے ہی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں جن کی مستحکم حکومتیں اپنوں کی غداری کی وجہ سے ختم ہو گئیں۔ مولانا ظفر کے زمانے میں بھی کئی لوگ انفرادی واجتماعی سطح پر انگریزی سرکار کے کاسہ لیس اور حواری بنے ہوئے تھے۔ غلامی کی زنجیروں کو نہ صرف مضبوط کرنے میں معاونت کے قصوروار تھے بلکہ دیس کی معاشرتی، سماجی اور سیاسی بنیادیں بھی کھوکھلی کر رہے تھے۔ یونینسٹ پارٹی جس طرح برطانوی راج کی دیواروں کا سہارا بنی ہوئی تھی، اس پر ان کی نظموں میں شدید ردِ عمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ ''اخباری ٹوڈی کی آمد آمد'' میں لکھتے ہیں:

لندن میں پھر رہے ہیں کہ رکھ لیں کسی طرح — سر جان سائمن کا بھرم سر عمر حیات

ارون کو فخر کیوں ہے ہری سنگھ گوڑ پر — کیا ان سے کچھ وفا میں ہیں کم سر عمر حیات

گر شیوہ اس ذلیل خوشامد کا چھوڑ دیں — ہم پر کریں بڑا ہی کرم سر عمر حیات(۲)

ظفر علی خان جیسے حریت کے علم بردار کسی بھی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دنیا میں سب سے بڑا خوف موت کا ہوتا ہے۔ مسلمان ہونے کے ناطے ان کا یہ تو یقین تھا کہ موت خدا کے علاوہ اور کسی کے ہاتھ میں نہیں اور مرنے کے لیے اگر وطن جیسی چیز سامنے ہو تو ایسی موت شہادت کہلاتی ہے۔ افراد کی موت سے زیادہ اقوام کی موت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک غلامی کو قبول کر لینا ہی دراصل موت کے مترادف ہے۔ مولانا کا نظریۂ موت وحیات فلسفیانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ ان کے اس نقطۂ نظر سے انکی قوم وملت میں ہمت واستقلال کا جوہر پختہ ہوتا ہے۔ دکن ریویو کے ایڈیٹوریل میں راقم طراز ہیں:

"انسان جب حیات وموت کے مسئلہ پر غور کرتا ہے تو کوئی زبردست مگر پراسرار ادراکی قوت اس کے نفس ناطقہ سے بے اختیار کہلواتی ہے کہ میں مرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔"(۳)

ان کی تربیت میں اپنے وطن اور مذہب سے محبت شامل تھی اوراس پر کسی قسم کا سمجھوتا کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ استعماری طاقت کے جبر واستبداد کو انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی قبول نہ کیا۔ انھیں یقین تھا کہ ہندوستانیوں کی جدوجہد ضرور ایک دن کامیاب ہوگی۔ قید وبند سمیت مختلف قسم کی جو قربانیاں دی جارہی ہیں وہ لازم رنگ لائیں گی۔ اپنی نظم "نوید آزادئ ہند" میں اس کا برملا اظہار کیا:

وہ دن آنے کو ہے آزاد جب ہندوستان ہوگا — مبارکباد اس کو دے رہا سارا جہاں ہوگا
برہمن مندروں میں اپنی پوجا کر رہے ہونگے — مسلماں دے رہا اپنی مسجد میں اذاں ہوگا
من وتو کے جتنے خش خشے ہیں مٹ چکے ہونگے — نصیب اس وقت ہندو اور مسلماں کا جواں ہوگا
توانا جب خدا کے فضل سے ہم ناتواں ہونگے — غرور اس وقت انگریزی حکومت کا کہاں ہوگا(۴)

کالونیل سامراج کا حکومت کرنے کا طریقہ 'تقسیم کرو' کی پالیسی میں مضمر رہا جس کے لیے انھوں نے ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دی۔ لسانی اور مذہبی اور تاریخی اور سیاسی معاملات کی تشریح وتوضیح کے ذریعے اختلافات کو بڑھاوا دیا گیا اور کئی لوگ شعوری اور کئی لاشعوری طور پر اس تقسیم اور جھگڑے کا حصہ بنتے گئے۔ رائے عامہ میں کئی طرح کے نقطہ ہائے نظر سامنے آنے لگے۔ ان تمام مباحث میں الجھا کر دراصل حکومت اپنی گرفت ملک پر مضبوط سے مضبوط کرتی گئی۔ مولانا ظفر علی جیسے دور رس نگاہ رکھنے والے اشخاص اس سازش سے باخبر تھے۔ ان کے خیال میں ہندو مسلم سمیت تمام وطن کے باسیوں کا اتحاد وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ورنہ غلامی کی زنجیریں توڑنا ممکن نہ رہے گا۔ اسی لیے وہ اتحاد کے لیے ہمیشہ سرگرم رہے:

یاد عالم کو دلاتا ہوں فرائض اس کے — آئے دن یہ شرارت میں کیا کرتا ہوں
ہندوؤں کو میں ملاتا ہوں مسلمانوں سے — کانگریس کی بھی میں سفارت کیا کرتا ہوں

وہ اپنے عقیدے میں بھی راسخ تھے۔ ہندوستان کی کروڑوں عوام اگر غلامی کی چکی میں پس رہی تھی جس کے لیے ان کی پریشانی بجا تھی مگر اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کے لیے بھی دردمندی کے جذبات رکھتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں سلطنتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد برطانوی اور دیگر یورپی نوآبادیاتی طاقتیں مشرقِ وسطیٰ میں اپنے حلیف ڈھونڈ رہے تھے اور اس کے لیے وہ عربوں کے اندر ہم نوا بنانے کے لیے سرگرم تھے۔ فلسطین میں یہودی آبادکاری بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ مولانا ظفر علی خان عالمی سیاسی منظرنامے کو بخوبی سمجھ رہے تھے۔ ان کی نظر میں یہ فقط جغرافیہ کی جنگ نہیں بلکہ نظریاتی سطح پر بھی چپقلش چل رہی تھی جس میں دینِ اسلام شدید خطرے میں تھا چنانچہ اس معاملے کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے انھوں نے لکھا:

کام انگریز کا دنیا سے مجھے دین سے ہے — اس کے قانون کی ٹکر میرے آئین سے ہے

خونِ اسلام سے گلرنگ ہوا حوضۂ قدس　　خبر اڑتی ہوئی آئی یہ فلسطین سے ہے

مندرجہ بالا اشعار جس نظم سے لیے گئے ہیں۔ اس کا عنوان ''لندن کے قوانین سے مدینہ کے آئین کی آویزش'' ہے۔

طاغوتی طاقتوں کے خفیہ اتحاد کے خلاف اگر کوئی چیز مدد گار و معاون ہو سکتی ہے تو وہ ''اتحاد'' ہے۔ اپنے وطن میں بین المذاہب ہم آہنگی پر زور دیتے رہے اور عالمی سطح پر وہ اتحادِ امتِ مسلمہ کا پرچار کرتے رہے کیونکہ شیرازہ اگر بکھر گیا تو پھر مسلمانوں کو زیر کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں انھوں نے فرمایا:

اخوت اس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں　　تو دہلی کا ہر اِک پیر و جواں بے تاب ہو جائے

یورپی اقوام کا ایک مسئلہ نسلی برتری کا بھی ہے خصوصاً انگریز نہ صرف گورے اور کالے رنگ کو بلندی و پستی کا معیار بناتے ہیں بلکہ اپنے علاوہ دوسرے خطے کے لوگوں کو غیر مہذب اور جاہل تصور کرتے ہیں جبکہ وہ خود تہذیب یافتہ اور ارفع خیالات کے مالک ہیں۔ یہاں ہندوستان میں حکمرانی کے دوران ان کا رویہ مقامی افراد کے ساتھ تحقیر آمیز اور ہتک آمیز تھا۔ مولانا ظفر علی خان جیسے دانش وروں کے لیے یہ بات ناقابلِ قبول تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

یورپ والو تم تو سمجھتے ہی نہیں ہو انسان ہمیں
اور جو سمجھتے بھی ہو تو شاید جانتے ہو نادان ہمیں
ہم کو ہمارے حال پہ چھوڑ یے آئے ہم اس تہذیب سے باز
کچھ نہیں یورپ سے ہمیں مطلب چاہیے انگلستان ہمیں (۵)

نو آبادیاتی نظامِ معیشت بھی دور بین دانش وروں کو قبول نہ تھا کیونکہ ان کے خیال میں اس طرح ہر گزرنے والا دن غلامی کی زنجیروں کو مضبوط تر کرتا چلا جائے گا۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال اور مولانا کا موقف یکساں تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ علامہ کی نظمیں کبھی کسی جلسے میں پڑھ دی گئیں یا کسی ادبی رسالے میں چھپ گئیں جبکہ ظفر علی خان اپنے اخبار ''زمیندار'' کی وجہ سے مسلسل حکومت کی نظر میں رہتے تھے۔ علامہ کو اخبار کی خدمات کا اعتراف تھا۔ جب بھی اخبار پابندیوں کی زد میں آتا تو انھیں اس کا دکھ ہوتا:

> ''اخبار زمیندار سے حضرت علامہ کو ہمیشہ ہمدردی رہی اور سیاسی اختلافات کے ایک مختصر عرصے کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ زمیندار کے قلمی معاون بھی رہے۔ جب یہ اخبار اپنی حریت آموزی اور خرمن استعمار پر شعلہ افشانی کے باعث زیرِ عتاب آجاتا اور جرمانہ یا بندش یا پریس کی ضبطی وغیرہ جیسی سزاؤں سے نوازا جاتا تو حضرت علامہ کو اس کا بہت دکھ ہوتا۔''(۶)

علامہ کو اس بات کا ادراک تھا کہ عوام میں شعور کی بیداری تک آزادی کا حصول محض خواب ہی رہے گا اور اس کے لیے بہترین وسیلہ اخبارات ہیں اور ان میں حرکت پیدا کرنے والے مضامین اور شاعری اہمیت کے حامل ہیں۔ خود سرکاری میڈیا اور ٹوڈی پریس انگریزوں کی حکومتی برکتوں کا پرچار کرتے رہتے تھے جس سے ایک خاص قسم کی رائے عامہ ہموار ہوتی تھی۔ اس کے توڑ کرنے کے لیے مولانا ظفر علی خان کی نظمیں مؤثر کردار ادا کر رہی تھیں۔

ردِ استعمار میں جہاں ایک طرف ظفر علی خان نے خوشامدیوں کو آڑھے ہاتھوں لیا وہیں جن لوگوں نے آزادی کے لیے جدوجہد کی ان کو دل کھول کر سراہا۔ خواتین کے کانگریس کے پلیٹ فارم سے کردار کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

کانگریس میں بھی ہیں کچھ مرد مگر حق ہے یہی　　گرم ہنگامۂ ہند اس کی خواتین سے ہے

اقبال کے ساتھ رشتۂ حریت کا یہ عالم تھا کہ بقول جعفر بلوچ:

"بہارستان کی ایک نظم بعنوان "پرانی روشنی" کے وضاحتی نوٹ میں مولانا ظفر علی خان فرماتے ہیں "اس نظم میں آدھے شعر میرے ہیں اور آدھے علامہ ممدوح (اقبال) کے۔"(۷)

مشرق کا خطہ ہمیشہ سے پُرامن رہا۔ باہر سے آنے والے جنگجوؤں اور حملہ آوروں نے اس کے سکون کو برباد کیا۔ اس روایت کو نبھاتے ہوئے انگریزوں نے یہاں کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کیے رکھا تاکہ مقامی آبادی کو دبائے رکھے۔ کالونیل عزائم کی عملداری کے پس منظر میں ظفر علی خان نے اپنی ایک نظم "لُوٹس" میں فرمایا تھا:

اُجڑے ہوئے چمن میں ہے بلبل کا آشیاں — منظور نہیں شاید اب اس آشیاں کی لوٹ
مغرب کے رہزنوں کی نظر میں ہے رات دن — مشرق کے نقدِ امن و متاعِ اماں کی لوٹ(۸)

مولانا ظفر علی خان کی مزاحمتی روش کی وجہ سے تحریکِ آزادی کو تقویت ملی۔ ان کے اخبار کی مقبولیت سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کس طرح ملک کے طول و عرض میں اس کے پیغام کو سن رہے تھے۔ ڈاکٹر سید احمد قادری نے لکھا:

"زمیندار کی غیر معمولی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب زمیندار سرحدی علاقے میں پہنچتا تو پٹھان ایک آنہ دے کر زمیندار خریدتے اور ایک آنہ پڑھوائی کے لیے دیتے۔۔۔ کانپور میں جب زمیندار کا بنڈل پہنچتا تو اس کا ایجنٹ اپنی دکان کا دروازہ بند کر لیتا تاکہ گاہک بے صبری کے عالم میں پرچے چھین کر نہ لے جائیں۔"(۹)

بلاشبہ ظفر علی خان کی شاعری میں وہ اثر پذیری تھی کہ جس سے استعمار خوف کھاتا تھا اور جس سے ہندوستانی عوام نے درس حریت لیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ ظفر علی خان، مولانا، چمنستان، یونائیٹڈ پبلشرز، لاہور، طبع اول، ۱۹۴۴ء، ص ۲۶۔۲۷
۲۔ ظفر علی خان، مولانا، بہارستان، اردو اکیڈمی پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷ء، ص ۵۳۶
۳۔ دکن ریویو، ایڈیٹر ظفر علی خان بی۔ اے، مطبع اختر دکن، فروری ۱۹۰۵ء، نمبر ۲، جلد سوم
۴۔ ظفر علی خان، مولانا، چمنستان، ص ۱۶
5۔ ظفر علی خان، پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور، 1913ء، ص ۵۵
۶۔ جعفر بلوچ، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۷
۷۔ ایضاً، ص ۹
۸۔ ظفر علی خان، چمنستان، ص ۳۲
۹۔ سید احمد قادری، ڈاکٹر، اردو صحافت بہار میں، مکتبۂ خوشیہ، بہار انڈیا، ۲۰۰۳ء، ص ۵۵

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havalajat

1. Zafar Ali Khan, Maulana, Chamanistan, United Publishers, Lahore, Tabaa Awal, 1944, P26-27
2. Zafar Ali Khan, Maulana, Baharastaan, Urdu Academy Punjab, Lahore, 1937, P536
3. Dakkan Review, Editor: Zafar Ali Khan B.A., Matbaa Akhtar Dakkan, February1905, No.2, Jild.3
4. Zafar Ali Khan, Maulana, Chamanistan, P16
5. Zafar Ali Khan, Publishers United, Lahore, 1913, P55

6. Jafar Baloch, Allama Iqbal aur Maulana Zafar Ali Khan, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1995, P74
7. Ibid, P9
8. Zafar Ali Khan, Chamanistan, P32
9. Syed Ahmad Qadri, Dr., Urdu Sahafat Bihar Mein, Maktaba Ghausia, Bihar (India), 2003, P55